اسبابِ عروج وزوالِ امّت

ذیل میں وہ تقریر درج کی جاتی ہے جو خاکسار راڈیٹر برہان نے ۲۷ اکتوبر ۱۹۴۱ء کی شام کو انجمن اسلامی تاریخ وتمدن مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کے زیر اہتمام اسلامی ہفتہ کی تقریب پر یونیورسٹی کے یونین ہال میں بصدارت ڈاکٹر محمود احمد صاحب ایم۔اے۔پی ایچ۔ڈی استاذ فلسفہ کی تھی۔ یہ تقریر پونے دو گھنٹہ تک زبانی ہوئی تھی۔ مگر اب اس کو قلمبند کر دیا گیا ہے۔ جلسہ میں یونیورسٹی کے اساتذہ۔ طلبا اور محترم خواتین کا بہت اچھا اجتماع تھا۔ سب نے اس تقریر کو جس خاموشی اور توجہ سے سنا اس کے لئے ناچیز مقرر سراپا تشکر وامتنان ہے۔

حضرات! تاریخ عالم کا یہ واقعہ کچھ کم حیرت انگیز نہیں ہے کہ ایک زمانہ میں مسلمانوں نے نہایت محیر العقول طریقہ پر ترقی کی اور اپنے کارناموں کا نقش صفحۂ تاریخ پر اس طرح ثبت کیا کہ دنیا کی دوسری قومیں ان کی عظمت وبرتری کے سامنے سر اطاعت خم کر دینے پر مجبور ہو گئیں۔ اب وہی مسلمان ہیں جن پر فلاکت وادبار مسلط ہے۔ ان کا شیرازۂ ملّی پراگندہ ہے۔ اب ان کی محفلوں میں علم وفن کے مذاکرے بہت کم ہوتے ہیں۔ دماغ قوتِ ابداع واختراع سے محروم۔ اور ہاتھ سیاسی طاقت وقوت کی عنان سے ناآشنا محض ہیں۔ مردم شماری کے لحاظ سے اتنے مسلمان پہلے کبھی نہیں تھے جتنے کہ اب ہیں مگر ساتھ ہی علم وعمل۔ ایمان وایقان اور روحانیت واخلاق کے لحاظ سے جتنے پست اور زبوں حال اب ہیں اتنے کبھی نہیں تھے۔ تاریخ اسلام کا ایک مبتدی بھی جانتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے چند سالوں بعد ہی مسلمانوں نے جزیرۃ العرب سے نکلکر دنیا کے مختلف گوشوں میں پھیلنا شروع کیا تو سخت ترین عداوتوں اور حوصلہ فرسا مقاومتوں کے باوجود اس انداز سے آگے بڑھتے

رہے کہ بنو امیہ کے دورِ حکومت کے اختتام سے پہلے پہلے جس کی مدت پورے اکیسو برس بھی نہیں ہے انھوں نے مشرق میں سندھ اور چینی ترکستان تک اور مغرب میں اندلس تک اپنی حکومت و مملکت کے حدود وسیع کر لئے اور ان ملکوں میں صرف سیاسی طاقت و قوت ہی حاصل نہیں کی۔ بلکہ اسلام کی حقانی تعلیمات۔ اور اسلامی تمدن و تہذیب کی ناقابل رد دلکشی نے اپنا ایسا رنگ جمایا کہ چند ملکوں کو چھوڑ کر تمام مفتوحہ ممالک خالص اسلامی ملک بن گئے۔ پھر علوم و فنون میں۔ ایجادات و اختراعات میں۔ تہذیب نفس اور نظام اخلاق کی ترتیب و تدوین میں انھوں نے اپنی ذہنی و دماغی عظمت و برتری اور ما فوق العادۃ عملی جد و جہد کا ایسا عمدہ ثبوت دیا کہ بڑے سے بڑا معاند مورخ بھی ان کو جھٹلانے کی جسارت نہیں کر سکتا۔ لیکن اب حالت بالکل دگرگوں ہے۔ زندگی کے ہر شعبہ میں ان پر ادبار و انحطاط کا تسلط ہے اور علم و عمل کے ہر میدان میں وہ سب سے پیچھے نظر آتے ہیں۔ کہیں جہالت و نادانی کا دور دورہ ہے۔ اور کسی جگہ دوسری اقوام عالم کی تقلید کا سودا ہے۔ اسلامی انفرادیت بہر حال اس قدر مضمحل ہو چکی ہے کہ آج کل کے مسلمانوں کو بحیثیت مجموعی پہلے زمانہ کے مسلمانوں کا جانشین یا ان کے منصب عظمت کا وارث کہنا اپنی ہنسی خود آپ اڑانے کے مترادف ہے۔

اس انقلاب عظیم کو دیکھ کر فلسفۂ تاریخ کے طالب علم کو قدرتی طور پر ان اسباب کا کھوج لگانے کی جستجو ہوتی ہے جن کی بنا پر مسلمانوں کی ماہیت یکسر منقلب ہو کر رہ گئی ہے۔ لیکن ان اسباب کو بیان کرنے سے قبل ضروری ہے کہ پہلے اجمالاً ان بنیادی عوامل و دواعی کو معلوم کر لیا جائے جو مسلمانوں کی عظیم الشان ترقی کا باعث بنے اور جنھوں نے یکجا ہو کر ان کو دنیا کی سب سے بڑی اور صالح ترین قوم بنایا۔ ان عوامل و دواعی کو معلوم کرنے کے بعد آپ تاریخی اعتبار سے دیکھیں گے کہ امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ مختلف اندرونی اور بیرونی اثرات کے ماتحت ان عوامل میں کس طرح اضمحلال پیدا ہوتا رہا۔ اور آخر کار کئی صدیاں گذرنے کے بعد جب یہ تدریجی اضمحلال اپنے آخری نقطہ تک پہونچ گیا تو اس کا نتیجہ بد وہ ہوا جو آج ہم سب کے سامنے ہے اور جس کا دردانگیز نظارہ ہر حساس مسلمان کی آنکھ کو ایک پیہم دعوت خونابہ فشانی۔ اور ہر دردمند دل کو مسلسل اذن

فغاں سنجی و ماتم سرائی دے رہا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ اس مختصر صحبت میں ایک ہزار برس سے زیادہ کی روئداد غم تفصیل کے ساتھ بیان نہیں کی جاسکتی۔ اس لئے میں اصولی طور پر صرف چند اہم امور کی طرف اشارہ کروں گا۔

حکمت | اربابِ علم جانتے ہیں کہ انسان میں دو قوتیں ہیں۔ ایک سوچنے اور غور کرنے کی قوت۔ جس کو قوتِ نظری کہتے ہیں۔ یہ قوت اشیاءِ عالم کی حقیقتیں دریافت کرتی۔ اور ان کی کنہ و ماہیت کا کھوج لگاتی ہے۔ پھر مختلف اعمال و افعال کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد فیصلہ کرتی ہے کہ کونسا عمل اچھا ہے اور اسلئے لائقِ اخذ ہے اور کونسا عمل برا ہے اور اس بنا پر قابلِ ترک ہے۔ قوتِ نظری کے اس فیصلہ کے بعد دوسری قوت یعنی قوتِ عملیہ کو تحریک ہوتی ہے اور وہ قوتِ نظری کے فیصلہ کے مطابق کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کی تحریک کرتی ہے۔ ان دونوں قوتوں کا تعلق انسان کے نفس سے ہے۔ ایک مبدأ ادراک ہے۔ اور دوسری مبدأ تحریک۔ پھر ان دونوں قوتوں کے ماتحت مختلف قوتیں ہیں جو اپنے اپنے دائرۂ اثر و عمل میں کام کرتی ہیں۔ تمام فلسفۂ اخلاق کی بنیاد انھیں دونوں قوتوں کے محرکات و مہیجات اور ان کے مقتضیات و مظاہر سے بحث کرنے پر قائم ہے۔ انھیں دونوں قوتوں کی بے اعتدالی سے جب یہ افراط و تفریط میں مبتلا ہوجاتی ہیں رذائل اخلاق پیدا ہوتے ہیں اور جب ان میں اعتدال پایا جاتا ہے تو اُن سے فضائلِ اخلاق کا ظہور ہوتا ہے۔ فلسفۂ اخلاق کی اصطلاح میں جس چیز کو حکمت کہتے ہیں وہ انھیں دونوں قوتوں کا اتکمال کا نام ہے۔ اور یہی حکمت ہے جو انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کی اساس و بنیاد ہے۔ اس بنا پر زندگی انفرادی ہو یا اجتماعی بہرحال اس کی کامیابی اور ترقی کا دارومدار اس ایک بات پر ہے کہ شخصی انفرادی یا قومی و اجتماعی قوتِ نظری اور قوتِ عملی دونوں تندرست ہوں۔ افراط و تفریط سے الگ ہوں اور اعتدال پر قائم رہ کر کسی چیز کو حسن یا قبیح سمجھنے یا کسی فعل کے کرنے نہ کرنے کے بارہ میں وہی رویہ اختیار کریں جو صحیح معنیٰ ایک میں تندرست اور معتدل قوت کو اختیار کرنا چاہئے۔ جس طرح ہر انسان کی الگ الگ قوتِ نظری اور قوتِ عملی ہوتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح ہر قوم کا ایک مزاج ہوتا ہے اور اس اعتبار سے

پوری قوم کی ایک قوتِ نظری ہوتی ہے جس کے آئینہ میں وہ اشیاءِ عالم کے حسن و قبح کو دیکھتی اور جانچتی ہے اور پھر اسی طرح ایک ہی اس پوری قوم کی قوتِ عملی ہوتی ہے جس کے باعث قوم کے تمام افراد متحد و متفق ہو کر کوئی کام کرتے ہیں۔ اس وقت ان افراد کے عقائد و اعمال میں ایک ہم آہنگی، یکسانیت اور استواری پائی جاتی ہے۔ ان سب کا مرکزِ نگاہ ایک ہوتا ہے۔ ایک ہی مقصد اور ایک ہی جذبہ کے ماتحت ان کی تمام حرکات ہوتی ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ اگر اس قوم کے مزاج میں فتور نہیں آیا ہے اور اس کا دماغ اور اس کے اعضا و جوارح تندرست ہیں تو اس قوم کا ہر اقدام مستحسن اور اس کا ہر عمل نیک ہوگا اور یہ قوم دنیا کے تمام انسانوں کیلئے رحمت و برکت کا سرچشمہ ثابت ہوگی۔ وہ جس کسی سمت کا رُخ کرے گی باطل اور شر و فساد کی تمام ظلمتیں خود بخود چھٹتی چلی جائیں گی۔ اور حق و صداقت کے آفتاب کی شعاعیں لحہ بلحہ وسعت پذیر ہوتی رہیں گی۔

اس مختصر ترین تمہید کے بعد اب اسلام کی تعلیمات پر غور کیجئے تو آپ کو معلوم ہوگا۔ تمام اسلامی تعلیمات اصولی اور اساسی طور پر صرف دو چیزوں سے متعلق ہیں ایک انسانی عقیدہ اور دوسری انسانی عمل و کردار۔ عقیدہ کا تعلق قوتِ نظری سے ہے اور عمل و کردار کا تعلق قوتِ عملیہ سے۔ بالفاظ صحیح تر یوں سمجھئے کہ اسلام نے ان دونوں قوتوں کے حدودِ عمل اور ان کے فرائض و واجبات کی تعیین کر کے انسان کے ہاتھ میں ایک ایسا دستور محکم دیدیا ہے جس کی روشنی میں بالکل صاف طریقہ پر یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ قوتِ نظری کو کس چیز کے متعلق حسن ہونے اور کس شے کی نسبت قبیح ہونے کا حکم لگانا چاہئے۔ اور اسی نسبت سے قوتِ عملی کو مرغوبات و مکروہات کی دنیا میں کسی عمل کے کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کرنا چاہئے، اسلام کا دستورِ اساسی یعنی قرآن مجید اول سے آخر تک انھیں امور کی تشریح و توضیح اور انھیں حدود و قدود کے بیان و تفسیر پر مشتمل ہے اور اس بنا پر یہ کہنا قطعاً بے مبالغہ ہے کہ اسلام کا منشا انسان کی قوتِ نظری اور قوتِ عملی کو کامل و مکمل کر کے اسے حکمتِ بالغہ کا درس دینا اور اس طرح اُس کو حقیقی طور پر اشرف المخلوقات بنانا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کو مومنین کے حق میں اپنا ایک بہت بڑا احسان جتاتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے

لَقَدْ مَنَّ اللّٰہُ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ	بیشک اللہ نے ایمان والوں پر احسان کیا جب اس
بَعَثَ فِیْھِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِھِمْ یَتْلُوْا	نے انہیں کے درمیان میں سے ایک رسول بھیجا وہ ان
عَلَیْھِمْ اٰیٰتِہٖ وَیُزَکِّیْھِمْ وَیُعَلِّمُھُمُ	پر اس کی آیتیں پڑھتا ہے۔ ان کو پاک کرتا ہے اور
الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ وَاِنْ کَانُوْا مِنْ	ان کو کتاب اور حکمت سکھاتا ہے، اگرچہ یہ پہلے کھلی
قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۝	ہوئی گمراہی میں تھے۔

یہی وہ حکمت ہے جس کو قرآن مجید کی آیت "ومن یؤت الحکمۃ فقد اُوتی خیراً کثیراً" میں خیر کثیر فرمایا گیا ہے۔ حکمت کو خیر کثیر فرمانے کی وجہ سے ہی علماءِ اخلاق نے کہا ہے کہ حکمت صرف علم کا نام نہیں بلکہ عمل بھی اس کے مفہوم میں داخل ہے۔ کیونکہ جو علم بغیر عمل کے ہو اس کا خیر کثیر ہونا تو کجا وہ تو سراسر وبال اور مصیبت ہے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے "جو علم بغیر عمل کے ہو وہ وبال ہے اور جو عمل بغیر علم کے ہو وہ ضلال ہے"۔ غرض یہ ہے کہ قرآن مجید ایک ایسا دستور العمل اور نظامنامہ اخلاق وعقائد ہے کہ اگر قوتِ نظری اور قوتِ عملی دونوں کی حرکت اس دستور کی روشنی میں ہوگی تو ان قوتوں کے مالک میں حکمت پیدا ہو جائیگی۔ جس طرح کوئی شخصِ واحد اپنے تمام عقائد واعمال کی بنیاد اس پر رکھیگا تو اس کی زندگی بہمہ وجوہ کامیاب ہوگی۔ ٹھیک اسی طرح جو قوم اس قرآن کو عقیدہ اور عمل دونوں میں اپنا اسوہ بنائیگی وہ بے شبہ دنیا کی سب سے زیادہ صالح اور کامیاب ترین قوم ہوگی۔ اور اسے حق ہوگا کہ سب سے بلند اور ارفع ہو کر رہے۔ آپ یہ نہ خیال کریں کہ ایک مسلمان کی حیثیت سے یہ دعویٰ محض کسی خوش اعتقادی پر مبنی ہے۔ اب میں اس کے دلائل بیان کرتا ہوں۔

حکمت کے تمام اقسام کو بیان کرنا اور پھر اسلامی عقائد واعمال کی اُن پر تطبیق کرنا۔ ایک طویل فرصت کا طالب ہے۔ اسلئے میں یہاں مختصراً اسلامی عقائد واعمال میں سے بعض بنیادی امور کا ذکر کرتا ہوں

جن کو مسلمانوں کے عروج و ترقی میں نمایاں دخل ہے۔ اس سے آپ کو معلوم ہوگا کہ اسلام نے انسانی قوتِ نظری اور قوتِ عملی کو کامل بنانے کے سلسلہ میں کس خاص نقطۂ نظر کو مرعی رکھا ہے اور مسلمانوں کے قومی کیرکٹر پر ان کا کیا اثر ہوا ہے۔

توحید | توحید کا تعلق قوتِ نظری سے ہے۔ ہر مسلمان جانتا ہے کہ اسلامی عقائد کی اساس و بنیاد اسی عقیدہ پر قائم ہے اس عقیدہ کا مفاد یہ ہے کہ انسان ذات و صفات میں کسی کو خدا کا شریک نہ بنائے وہ دل سے اس بات کا یقین رکھے کہ دنیا کے تمام نفع و ضرر کا مالک صرف خدا ہے۔ وہ ہمارا خالق ہے اور ہم اس کے مخلوق ہیں ہم سب صرف اسی کی اطاعت اور عبادت کریں گے کسی اور چیز کے سامنے اپنی پیشانی نہیں جھکائیں گے۔ ہمارا رزق، موت، زندگی، عزت و ذلت، کامرانی و ناکامی، دولت و غربت، ان سب کا ملنا ملانا محض خدا کے حکم سے ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ کوئی شخص خواہ اپنے زمانہ کا کتنا ہی بڑا بادشاہ ہو ان چیزوں میں سے کسی چیز کا ذرا بھی مالک و مختار نہیں ہے۔ اس بنا پر ہمیں صرف خدا سے ہی ڈرنا چاہیئے۔ اسی سے اپنی امیدیں وابستہ رکھنی چاہئیں اور جو کچھ مانگنا ہو اسی سے اس کو طلب کرنا چاہیئے۔ اس یقین و اذعان کے ساتھ دل سے اس بات کا بھی اقرار کرنا چاہیئے کہ انسان انسان سب برابر ہیں کوئی کسی کا حاکم اور کوئی کسی کا محکوم نہیں کسی شخص کو کسی دوسرے پر آمرانہ چیرہ دستی حاصل نہیں ہو سکتی۔ کسی شخص کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اللہ کے قانون کے علاوہ اپنی طرف سے کوئی قانون بنا کر اس کو بندگانِ خدا پر لازم کر دے البتہ نظامِ زندگی کو چلانے کیلئے صلاحیت و استعداد کے مطابق تقسیمِ عمل کی ضرورت ہوگی۔ اس بنا پر کوئی امیر ہوگا اور کوئی وزیر کوئی قاضی اور مفتی ہوگا۔ اور کوئی صنّاع و تاجر لیکن ان میں سے کسی کو کسی پر کوئی ذاتی فضیلت و برتری حاصل نہیں ہوگی۔ مرتبۂ انسانیت میں یہ سب برابر ہیں۔ ان سب کی مثال ایک بڑے انجن کے پرزوں کی سی ہے کہ یہ تمام پرزے اپنی اپنی جگہ کام کرتے ہیں تو انجن چلتا ہے اور انسان کی اجتماعی زندگی کی ٹرین کو کھینچ کر لیجاتا ہے۔ پس تمام بھلائیاں اور حقیقی فلاح و بہبود انھیں خوش نصیب

انسانوں کے لئے ہے جو اپنی ہستی کو خدا کے وجود ابدی و سرمدی میں فنا کر کے اپنی کوئی ذاتی خواہش اور جذبہ رکھتے ہی نہیں۔ ان کی محبت، عداوت، فقیری و درویشی، امارت و ثروت، اہل عالم سے مختلف باہمی تعلقات اور ان کی رعایت یہ سب صرف خدا کے لئے اور اسی کے حکم کے ماتحت اور اسی کا فرض بندگی بجالانے کے لئے ہوتا ہے۔ اور یہ انجن کے پرزوں کی طرح اپنے ذاتی نفع و ضرر سے بے خبر ہو کر محض خدا کی رضا جوئی کے لئے کام کرتے رہتے ہیں۔ ان کے علاوہ جو لوگ اللہ کے قانون سے سرکش و باغی ہیں اور دنیا میں شر و فساد پھیلاتے ہیں ان کی مثال اس پتھر کی سی ہے جو گاڑی کو روکنے کے لئے ریلوے لائن پر ڈال دیا گیا ہو ظاہر ہے اگر پتھر چھوٹا سا ہی ہے تو اس کو انجن کی تیز رفتار ہی خود بخود راستہ سے دور کر دیگی اور لائن صاف ہو جائیگی۔ اور اگر پتھر کی کوئی چٹان حائل ہو گئی ہے تو اس کو دور کرنے کے لئے زیادہ کد و کاوش کرنی پڑیگی بہر حال یہ سمجھ لینا چاہئے کہ زندگی کی شاہراہ پر حیاتِ اجتماعی کا انجن چلانے کے لئے جس طرح ضرورت ہے کہ انجن کے تمام پرزے ہم آہنگی اور یکسانیت کے ساتھ کام کرتے رہیں۔ اسی طرح ضروری ہے کہ لائن کو صاف رکھا جائے اور اس پر اگر کوئی پتھر وغیرہ گر پڑے تو اسے دور کر دیا جائے۔

عقیدۂ توحید کی اس مختصر تشریح کے بعد آپ خود معلوم کر سکتے ہیں کہ جو قوم اس عقیدہ کو اپنے دل و دماغ میں جاگزیں رکھے۔ اور صرف زبان سے اس کا اظہار نہ کرے بلکہ اس عقیدہ کی ایسی اذعانی اور یقینی کیفیت اس کے دلوں میں مرتسم ہو کہ لاکھ منطقی دلائل کے باوصف اس میں ذرہ برابر تذبذب پیدا نہ ہو سکے وہ کسی جماعت کی محکوم ہو کر کس طرح زندگی بسر کر سکتی ہے۔ اسی عقیدہ کا اثر تھا کہ دورِ اول کے مسلمان اپنے وجود کی انفرادیت کو یک قلم بھلا کر اپنے آپ کو خدا کے وجود کا ایک پرتو سمجھتے تھے اور گویا اُن کے ہر رُکنِ منہ سے یہ صدا آتی تھی ؎

دلِ ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر ہم اُس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

اس یقین کے باعث اُن کی نگاہ بلند تھی۔ حوصلے عالی اور ہمتیں ناقابلِ شکست و زوال تھیں

ان کا ایمان تھا کہ ہمارا مرنا جینا، اٹھنا بیٹھنا اور کھانا پینا سب خدا کے لئے ہے۔ ہمارا مقصدِ زندگی خدا کے احکام کی بجاآوری اور اس کے اوامر و نواہی کی دنیا میں تبلیغ و اشاعت ہے اور بس۔ اس کے علاوہ زندگی کا کوئی اور مصرف ہی نہیں ہے۔ اس قوی تصور اور ایمانِ محکم کی وجہ سے ایک طرف وہ دنیا کی بڑی سے بڑی شہنشاہیت اور دنیوی جاہ و حشم سے ذرہ برابر مرعوب نہیں ہوتے تھے۔ اور دوسری جانب چونکہ ان کے عزائم مستحکم اور ایک مرکزِ الٰہوتی سے وابستہ ہو جانے کی بنا پر اُن کے ارادے پہاڑ کی طرح مضبوط اور اٹل تھے اسلئے اُنکے راستہ کوئی مانع نہیں تھا۔ فلسفۂ خودی کا یہی وہ راز ہے جو ان کے دلوں میں پوشیدہ تھا اور جس نے مختلف ملکاتِ اخلاق کی شکل میں ظاہر ہو کر ان سے حیرت انگیز کارنامے ظہور پذیر کرائے۔ جو لوگ قوتِ ارادی کی عجوبہ زائیوں سے واقف ہیں انھیں اس بات کے باور کرنے میں کوئی دشواری نہ ہونی چاہئے کہ ایک قوم عالم کے مبدأ فیاض سے اپنا رشتہ استوار کر کے دنیا میں کیسے کیسے عجیب و غریب کارنامے کر سکتی ہے۔

انتقاء | یہاں تک میں نے جو کچھ عرض کیا ہے اس سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ اسلام نے عقیدۂ توحید کی تلقین و تعلیم دے کر انسان کی قوتِ نظری کو کس درجہ معتدل، صالح اور درست بنا دیا اور کس طرح اس کو اشیاء کے حسن و قبح معلوم کرنے کا ایک معیار بتا دیا ہے کہ جو چیز بھی اس معیار پر پرکھی جائے گی اس میں کسی غلطی کا امکان نہیں ہے۔ اب اجمالاً بعض ان اعمال کا ذکر کرنا بھی نامناسب نہ ہو گا جو اسلام نے قوتِ عملی کی تہذیب و تربیت کے لئے منصوص کئے ہیں۔

توحید کا قائل ہو جانے کے بعد طبعاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سے اعمال ہیں جن سے خدا خوش ہوتا ہے اور جن کو کرنے سے اس کی رضامندی حاصل ہوتی ہے۔ اور وہ اعمال کیا ہیں جو اس کے قہر و غضب کا موجب بنتے ہیں۔ عقائد کے علاوہ اسلام کی تمام تعلیمات انھیں اعمال کے بیان اور ان کی تشریح و توضیح پر مشتمل ہیں۔ ان تمام اسلامی اعمال و افعال میں افراط و تفریط سے ہٹ کر اعتدال کی پوری رعایت رکھی گئی ہے۔ بالفاظِ مختصر یہ کہا جا سکتا ہے کہ تمام اسلامی اعمال کی بنیاد اتقار پر قائم ہے یعنی وہ معاملات

جن کا تعلق اللہ اور بندہ کے تعلق سے ہے اور وہ معاملات جو ایک انسان کے دوسرے انسان کے ساتھ ہوتے ہیں۔ ان دونوں قسم کے معاملات میں بنیادی طور پر اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ تمام انسانی اعمال و افعال کا مقصد حکم خداوندی کی بجاآوری ہے۔ یہانتک کہ اگر باپ بیٹے پر خرچ کرتا ہے، یا بیٹا باپ کی تعظیم وتکریم کرتا ہے تو اس کی نیت یہ ہونی چاہئے کہ چونکہ خدا نے اس تعلقِ اُبوّت وبنوّت کی بنا پر مجھکو یہ حکم دیا ہے اس لئے میں یہ کام کر رہا ہوں۔ اگرچہ اس فعل سے حظِ نفس بھی ضرور حاصل ہوگا۔ لیکن ذاتی حظِ نفس کا حصول مقصدِ کار نہ ہونا چاہئے۔ اس ایک مثال پر ہی دوسرے شخصی اور بین الاقوامی تعلقات کو قیاس کر لیجئے۔ غرض یہ ہے کہ اسلامی اعمال میں روحِ اتقار کے کارفرما ہونے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسانی قبائل و افراد کو قبائلی عصبیت اور دوسرے اور تعصباتِ جاہلیت مثلاً وطنیت۔ رنگ ونسل کی برتری۔ دولت وثروت کا غرور جسمانی طاقت وقوت کا گھمنڈ۔ خود غرضی۔ نفس پرستی اور تن پروری، باہمی تباغض وتحاسد، خواہ شخصی ہو یا اجتماعی، ان میں سے ہر ایک لعنت سے نجات مل جاتی ہے۔ اور ان لعنتوں میں گرفتار ہو کر انسانیت کو جس درد وکرب سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ انسانی سوسائٹیاں ان سے محفوظ ہو کر امن وعافیت کی زندگی بسر کرتی ہیں۔

اسلامی اوامر ونواہی کا مطالعہ آپ علم النفس کی روشنی میں کیجئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اسلام نے قوائے عملیہ میں سے کسی قوت کو نہ تو بالکل جامد وخامد کرنا چاہا ہے اور نہ اس کو بالکل مطلق العنان چھوڑا ہے کہ جو چاہے کرے بلکہ بشری تقاضوں کو ملحوظ رکھکر ہر ایک قوت کے حدود عمل کی تعیین وتحدید کر دی ہے، مثلاً قوتِ شہوی کا کام ہے جلب ملائم۔ اور قوتِ غضبی کا دفع مضار۔ تو اسلام نے یہ بتایا کہ درحقیقت ملائم یا مرغوب کونسی چیز ہے اور کونسی نہیں۔ پھر یہ بتایا کہ اگر یہ چیز ملائم ومرغوب ہے تو اس کے جلب وتحصیل کا کیا طریقہ ہے؟ نیز اس کی بھی تشریح کر دی کہ یہ جلب وتحصیل کتنا ہونا چاہئے؟ اس کی کتنی مقدار نافع ہے اور کتنی مضر! اسی طرح قوتِ غضبی کا کام ہے دفع مضار۔ تو اسلام نے اس قوت کی تہذیب کے لئے

بتایا ہے کہ واقعی مضار کون کونسی چیزیں ہیں، پھر یہ کہ جو چیزیں مُضر یا مؤلم ہیں ان کو کس طرح دفع کرنا چاہئے اسلامی تعلیمات کی یہی وہ جامعیت اور موزونیت ہے جس کی وجہ سے ان میں اتنی لچک ہے کہ وہ ہر زمانہ میں اور ہر مقام پر اور ہر شخص کے لئے لائقِ عمل ہیں۔

عقیدۂ توحید و اتقار کا مجموعی اثر

حضرات! اسلامی عقائد و اعمال کی اس روح کو معلوم کر لینے کے بعد یہ بات بخوبی سمجھ میں آجاتی ہے کہ جو سوسائٹی ان پر کاربند اور عمل پیرا ہوگی اسے بے شبہ دنیا کی سب سے زیادہ مہذب شائستہ اور مدنیتِ صالحہ کا مالک ہونا چاہئے۔ کیونکہ یہی وہ سوسائٹی ہوگی جس کے دلوں میں کسی شخص یا کسی قوم کے خلاف ذاتی نفرت و عناد کے جذبات نہیں ہوں گے۔ یہ جماعت حق کی علمبردار اور باطل کے لئے آہنی دیوار یا ایک تیز تلوار ہوگی۔ اس کی نظر میں امیر و غریب، شاہ و گدا۔ گورے اور کالے، عربی اور عجمی سب برابر اور یکساں ہوں گے۔ ذاتی خصومت اور شخصی بغض و عناد کے باعث اس جماعت کا کسی شخص یا کسی قوم سے کوئی بگاڑ نہ ہوگا۔ ملک گیری، یا ملوکیت پرستی کا اس جماعت کے وہم و گمان میں بھی گذر نہیں ہو سکتا۔ عام بندگانِ خدا کی رفاہیت۔ اور ان میں انس و عافیت کی فضا قائم کرنا ان کا اولین مطمحِ نظر ہوگا۔ دوسری طرف اس جماعت کو خدا پر بھروسہ ہوگا۔ اور اس لئے یہ جس کام کا عزم کر کے اٹھیگی اُسے مخالفت و مقاومتِ شدید کے باوجود پورا کر کے رہیگی۔ اس جماعت کا امیر ذیشان، صاحب علم و نشان ایک گدائے گوشہ نشین کی طرح متواضع منکسر اور فروتن ہوگا۔ اور وہ اپنی دولت و امارت کو عطیۂ خداوندی سمجھکر اُسے خلق اللہ کی خدمت کے لئے وقف کر دیگا۔ اور پھر جو ان میں فقیر و مفلس ہوں گے ان کے ہاتھ اگرچہ خالی ہوں گے اور ان کے گھروں میں شاید بوریے بھی نہ ہوں لیکن ان کی آنکھوں میں استغنا کا نور چمکتا ہوا اور ان کی پیشانیوں سے قناعت و صبر کا اطمینان برستا ہوا نظر آئیگا۔ قلتِ مال بلکہ فقدانِ مال کے باوجود دبدبۂ سکندری ان کے چہرہ بشرہ سے عیاں۔ اور جاہ و جلال فریدونی ان کی صورت و شکل سے آشکارا ہوگا، یہ خدا کے ہوں گے اور خدا ان کا ہوگا۔ جدھر یہ رخ کریں گے اقبال و ظفرمندی

ان کا قدم لے گی۔ ان کو ہتھیاروں اور توپ و تفنگ کی بھی ایسی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ یہ جس طرف نگاہ اٹھائیں گے قوموں اور جماعتوں کی تقدیروں کو پلٹ کر رکھدیں گے۔ یہ جس زمین پر اپنے گھوڑے دوڑائیں گے زمین اپنے خزانے اگل کر ان کی کنجیاں ان کے ہاتھوں میں دیدیگی، صرف خشکی میں اور زمین کے اوپر نہیں بلکہ سمندروں کی طوفانی موجوں میں بھی حق کا علم سرفراز و سربلند کرنے کیلئے یہ کود پڑیں گے تو یہ متلاطم موجیں بھی ان کے عزائم روک نہ سکیں گی۔ اب آپ عہدِ صحابہؓ کے حالات کا مطالعہ کیجئے اور بتائیے کہ ان اوصاف کی حامل کیا ان صحابہؓ کے علاوہ دنیا میں کوئی اور جماعت بھی ہوئی ہے؟ یہ میں نے جو کچھ عرض کیا اس میں ذرہ برابر شاعرانہ مبالغہ نہیں ہے۔ بلکہ ایک حقیقتِ واقعہ ہے جس کی شہادت تاریخ کے صفحات اب بھی دے رہے ہیں، دنیا میں بڑے بڑے بہادر اور شیر افگن رستم و سہراب پیدا ہوئے۔ مگر بتاؤ کسی قوم میں کوئی بہادر علیؓ جیسا بھی پیدا ہوا جس نے اپنے سخت ترین دشمنِ جاں کافر کو اس پر قابو پالینے کے بعد محض اس لئے چھوڑ دیا کہ اس نے ان کے منہ پر تھوک دیا تھا کہ اب اگر وہ اس کو قتل کرتے تو اس میں ذاتی انتقام کا شائبہ بھی پیدا ہوا جاتا تھا، دنیا میں بڑے بڑے عادل۔ انصاف پسند اور رحمدل بادشاہ گذرے ہیں۔ مگر کوئی قوم عمرؓ جیسا بھی کوئی حکمران پیش کرسکتی ہے جو پیوند لگے ہوئے کپڑے پہنکر اور فرشِ خاک پر بیٹھکر عرب و ایران کی قسمتوں کے فیصلہ کرتا تھا اور جسے بیوہ اور غریب عورتوں کے چولھوں میں آگ جلانے اور کھانا پکانے میں بھی دریغ نہیں ہوتا تھا۔ قوم و وطن کے لئے عظیم الشان قربانیاں کرنے والوں کی کمی نہیں۔ لیکن انسانی جدوجہد کی پوری تاریخ بھی خلیفۂ سوم حضرت عثمانؓ کی کوئی مثال پیش کرسکتی ہے کہ فتنہ پردازوں نے آپ کے مکان کا محاصرہ کرلیا ہے۔ یہانتک کہ ایک شخص مکان میں داخل ہوکر آپ کو قتل بھی کردینا چاہتا ہے۔ مگر صاحبِ خلافت و امارت ہونے کے باوصف آپ ان لوگوں کے مقابلہ میں کسی ایک شخص کو بھی تلوار اٹھانے کی اجازت محض اس لئے نہیں دیتے کہ کہیں فتنہ کے دروازہ کا کھلنا آپ کی ہی طرف منسوب نہ کیا جائے۔ غور کرو۔ انتہائی شجاعت و دلیری کے ساتھ یہ تواضع و فروتنی اور خدا ترسی۔ سیاسی طاقت و قوت کے باوجود

معمولی درجہ کے انسانوں کے ساتھ بالکل مساویانہ بلکہ خادمانہ برتاؤ۔ شدت وصولت کے ساتھ رحمدلی اور رقت، فقیری اور مفلسی کے ساتھ کامل استغنا اور اطمینان نفس۔ کمال دولت وایالت کے ہوتے ہوئے یہ حیرت انگیز بے نفسی اور بے غرضی۔ قبائلی عصبیت کی مسموم آب وہوا میں پرورش پانے کے باوجود اسلام قبول کرتے ہی ان میں ایسا انقلاب پیدا ہوجانا کہ اسلام قبول کرکے جو ان کا بھائی بن جاتا ہے اس کے لئے یہ سب کچھ قربان کرنے کے لئے دل وجان سے آمادہ ہوتے ہیں۔ اگرچہ عہدِ جاہلیت میں قبائلی رقابت کی بنا پر ان میں کیسی ہی معرکہ آرائیاں ہوچکی ہوں اور اس کے برعکس خاص اپنے عزیزوں قریبوں اور چہیتوں کو اللہ کے راستہ میں قتل کرنے پر آمادہ ہوجانا جن کی حمایت ودافعت اسلام سے پہلے ان کی زندگی کا اولین فریضہ تھا، مختصر یہ کہ مختلف ومتضاد اخلاق وملکات میں یہ توازن واعتدال کیا سوائے اس جماعت کے کسی اور میں بھی پایا جاسکتا ہے جس کی قوتِ نظر وعمل کسی غیر معمولی اثر کے ماتحت نہایت معتدل ومہذب ہوچکی ہو۔ اور جس نے تمام انفرادیتوں کو یکقلم فراموش کرکے اپنے آپ کو ایک وجودِ اعلیٰ واشرف کے ساتھ وابستہ کرلیا ہو۔

ایک دو نہیں صحابہ کرام کی سوانح حیات سے ہزاروں مثالیں ایسی پیش کی جاسکتی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ تمام اوصافِ حمیدہ واخلاقِ فاضلہ بیک وقت اسی جماعت میں پائے جاتے تھے جو براہِ راست مشکوٰۃِ نبوت سے منور ہورہی تھی۔ ہر دور میں اور ہر جماعت میں بڑی بڑی خوبیوں کے انسان پائے جاتے رہے ہیں۔ لیکن اس کی مثال ملنی مشکل ہے کہ عرب کے بدوؤں جیسے غیر مہذب وناشائستہ لوگوں میں سے یکایک ایک بہت بڑی جماعت ایسی پیدا ہوگئی ہو جس کا ہر ہر فرد ذہنی وعملی محاسن کے آسمان کا آفتاب وماہتاب بنکر چمکا ہو۔ اور جس نے فکر ونظر اور عمل واخلاق کے بہترین نمونے پیش کرکے اپنے انسانِ اعلیٰ ہونے کا ثبوت بہم پہنچایا ہو۔

اس مختصر گذارش سے یہ حقیقت روشن ہوجاتی ہے کہ اسلام کے اولین دور میں جو مسلمان جماعت پیدا ہوئی وہ چونکہ فکری اور نظری اعتبار سے عقیدۂ توحید پر ایمان صادق وراسخ رکھتی تھی اور پھر عملی لحاظ سے

اس کے تمام کاموں میں، عبادات و معاملات میں۔ اخلاق اور عادات میں "اتقا" کی روح کارفرما تھی۔ اس بنا پر یہ جماعت دنیا کی سب سے زیادہ صالح جماعت تھی اور بقاء اصلح کے قانون فطری کے مطابق اس جماعت کو ہی حق تھا کہ وہ سب پر فائق و برتر ہو کر رہے۔ چنانچہ یہی وجہ تھی کہ احکم الحاکمین کی طرف سے ان کو مژدہ سنایا گیا

لا تھنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون۔ تم سبکسر نہ ہو اور غم نہ کرو۔ تم تو بلند ہو۔

پھر ان کو اللہ نے خود اپنی جماعت قرار دیا اور ان کیلئے فلاح کا وعدہ فرمایا گیا۔ ارشاد ہے۔

الا ان حزب اللہ ھم المفلحون ۔ خبردار رہو کہ بے شبہ اللہ کا گروہ ہی فلاح یاب ہوگا

شاعرِ ملت اقبال نے کہا ہے۔

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

اس میں شبہ نہیں کہ یقینِ محکم اور عملِ پیہم یہی دو ہتھیار ہیں جن سے کوئی قوم اپنے دشمنوں پر فتحیاب ہو سکتی ہے۔ لیکن جیسا کہ میں ابھی بتا چکا ہوں۔ یہ صرف فرزندانِ اسلام کی خصوصیت ہے کہ وہ یقین محکم رکھتے ہیں لیکن کس چیز کا؟ نسلی۔ وطنی۔ یا علمی اعتبار سے دوسروں پر فائق ہونے کا نہیں بلکہ اس بات کا کہ

"خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو زباں تو ہے"

پھر یہ قوم عملِ پیہم بھی کرتی ہے تو اسی غالب تصور و ایمان کے زیر اثر۔ اس بنا پر یہ ظاہر ہے، کہ مسلمانوں کا "یقینِ محکم" اور اُن کا "عملِ پیہم" اپنے اندر ایک ایسی خصوصیت فائقہ رکھتا ہے کہ وہ عقیدۂ توحید اور اعمال میں "اتقا" کی رعایت رکھے بغیر کسی میں پیدا ہی نہیں ہو سکتی۔ تیسری چیز جو اقبال نے بیان کی ہے وہ محبت ہے جس کو انھوں نے فاتحِ عالم کہا ہے۔ یقینِ محکم اور عملِ پیہم کی طرح یہ "محبت" مسلمانوں کی طرح دوسری اقوام میں پائی جا سکتی ہے۔ مگر مسلمانوں کی محبت بھی ان کے یقین و عمل کی طرح دوسری اقوام کی محبت سے یکسر مختلف ہے۔ ان کی محبت کسی ذاتی حظِ نفس۔ یا نفسی خواہش پر مبنی نہیں ہوتی۔ بلکہ خدا کے تعلق کے اعتبار سے اس محبت کی بنیاد انسانی اخوت کے احساس اور خلوص وللّٰہیت کے جذبہ پر قائم ہوتی ہے

اسی محبت کو "حب فی اللہ" کہتے ہیں۔ اس محبت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مسلمان کسی قوم سے اگر جنگ بھی کرتے ہیں تو چونکہ اس جنگ میں ہوس ملک گیری یا جذبۂ ملوکیت پسندی کو دخل نہیں ہوتا۔ بلکہ بندگانِ خدا کی اصلاح و ہدایت۔ اور خالصۃً لوجہ اللہ اعلاء کلمۂ حق اس کا مقصد ہوتا ہے اس بنا پر یہ عام فاتحین عالم کی طرح مفتوح اقوام کے ساتھ ناگوار جبر و تشدد کا معاملہ نہیں کرتے اور سختی کے ساتھ ان احکام کی پابندی کرتے ہیں جو اس بارہ میں ان کو خدا نے بتائے ہیں۔ اِس صلح جویانہ روش کا اثر یہ ہوتا ہے کہ فریق مخالف اپنے ہنگامی یا جذباتی بغض و عناد کی عینک اتار کر جب ان کے اخلاق و اعمال اور ان کے مقدس باطنی احساسات و جذبات کا جائزہ لیتا ہے تو اس کی عداوت محبت سے اور اس کا تنافر اُنسیت و اُلفت سے بدلجاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مسلمان صرف کسی ملک کی زمین کو ہی فتح نہیں کرتے بلکہ اپنی للّٰہیت اور انسانی خیر اندیشی و خیر سگالی کے باعث اہلِ ملک کے دلوں کو بھی مسخر کر لیتے ہیں یہی وجہ تھی کہ ایران کی جنگ میں ایرانی فوج کے چار ہزار سپاہی بیک وقت مسلمان ہو گئے اور اپنے ساتھیوں کو چھوڑ کر مسلمانوں کی صف سے آملے۔ پھر یہ لوگ یونہی دکھاوے کے مسلمان نہیں تھے بلکہ ان کی جو تلواریں مسلمانوں کے مقابلہ میں کام آتی تھیں اب ان کی حمایت و اعانت میں کام آنے لگیں چنانچہ یہ سب حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کے زیرِ علم مدائن اور جلولاء کی جنگ میں شریک ہوئے اور اس معرکہ کو جیت کر سرخروئی حاصل کی۔ فاتح سندھ محمد بن قاسم کو کون نہیں جانتا کہ اس نے سندھ میں دشمن کو کس بری طرح پامال کیا تھا لیکن ساتھ ہی اپنے اسلامی اخلاق اور کیرکٹر سے مفتوحین کے دلوں کو بھی فتح کر لیا تھا۔ چنانچہ علامہ بلاذری کے الفاظ یہ ہیں:۔

"یزید بن ابی کبشہ السکسکی سندھ کا گورنر ہو کر آیا۔ اور اس نے محمد بن قاسم کو گرفتار کر کے عراق روانہ کیا تو اہلِ ہند زار و قطار روتے تھے اور انھوں نے یادگار کے طور پر محمد بن قاسم کی تصویر بنا کر کیرج میں رکھی۔"

میں نے محبت کی یہ تشریح ضمناً ذکر آجانے کی وجہ سے کی ہے ورنہ اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ کیونکہ "عقیدۂ توحید اور اتقار" یہ دو بنیادی امور ہیں جن پر تمام فضائلِ اخلاق کی بنیاد قائم ہے انھیں فضائل اخلاق میں سے ایک محبت بھی ہے۔ فلسفۂ اخلاق میں "عدالت" کو جامع فضائلِ اخلاق کہتے ہیں۔ اس اعتبار سے کہا جاسکتا ہے کہ عقیدۂ توحید اور اتقار ان دونوں کا اثر یہ ہوتا ہے کہ انسان میں عدالت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ نظری اور عملی دونوں قسم کے کمالات و فضائل کا جامع بنجاتا ہے۔

اب اس وقت اس جماعت میں ایسی زبردست طاقت وقوت اور مصائب انگیزی وجفا کشی کی ایسی جرأت وہمت پیدا ہو جاتی ہے کہ دوسری جماعتیں اس کے سامنے سپر افگنی پر مجبور ہوجاتی ہیں اور اس جماعت کے غیر معمولی عزم وارادہ کو دیکھکر شاہانہ جاہ وجلال کے باوصف ان کے حوصلے ٹوٹ جاتے ہیں۔ حضرت نُعمان بن مُقرن کی سرکردگی میں سفرائِ اسلام شہنشاہِ ایران یزدگرد کے دربار میں پہنچے تو اُس وقت ایرانی رسم ورواج کے مطابق دربار اس شان وشوکت سے سجایا گیا تھا کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں خیرہ ہوئی جاتی تھیں۔ لیکن یہی سفرائِ اسلام جب عربی جبّے پہنے۔ کاندھوں پر یمنی چادریں ڈالے۔ اور ہاتھوں میں کوڑے لئے اور موزے پہنے نہایت بے باکی اور حد درجہ شانِ استغنا کے ساتھ دربار میں داخل ہوئے تو ان کے چہروں سے ایسی ہیبت ظاہر ہوتی تھی کہ شہنشاہِ ایران مرعوب ہوا جاتا تھا۔ ابو رجار الفارسی کے دادا کا جو بعد میں مسلمان ہوگئے تھے بیان ہے کہ میں خود قادسیہ کی جنگ میں شریک تھا اور ایرانیوں کی طرف سے مسلمانوں سے لڑ رہا تھا۔ شروع شروع میں عربوں نے ہم پر تیر پھینکے تو ہم نے کہا "یہ تیر کہاں ہیں، یہ تو تکلے ہیں" لیکن آخر کار انہی تکلوں نے ہمارا کام تمام کرکے رکھدیا ہم ادھر سے جو تیر پھینکتے تھے وہ کسی مسلمان کے کپڑوں سے الجھکر رہ جاتا تھا لیکن مسلمانوں کی طرف سے جو تیر آتا تھا مضبوط سے مضبوط زرہوں اور ڈبل خودوں کو چیرتا ہوا باہر نکل جاتا تھا۔"

اسی قسم کا ایک اور واقعہ سنئے۔ ایرانیوں کا شکست خوردہ لشکر قادسیہ سے بھاگ کر مدائن پہنچا

درمیان میں دریائے دجلہ پڑتا تھا۔ ایرانیوں نے دریا کو پار کرنے کے بعد تمام کشتیاں دریا سے الگ کرلیں اور پلوں کو آگ لگادی تاکہ مسلمان ان کے ذریعہ دریا کو عبور کرکے ان کا تعاقب نہ کرسکیں۔ لیکن مسلمان مسلمان تھے انھوں نے دریا میں گھوڑے ڈالدیئے اور دریا کو پار کرگئے۔ اب ایرانیوں نے یہ منظر دیکھا تو آپس میں کہنے لگے، "قسم خدا کی تم تو انسانوں سے نہیں جنوں سے لڑرہے ہو۔"

اب بتائیے کیا آپ سمجھتے ہیں کہ یہ عزم و حوصلہ اخلاقی اور روحانی قوت و انبساط کے بغیر کسی قوم میں پیدا ہوسکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ پس ایمان و عمل کا یہی وہ مقام رفیع تھا جس پر صحابہ کرامؓ کی جماعت فائز تھی اور اس بنا پر یہ جماعت دنیا کی سب سے زیادہ شائستہ اور صالح جماعت تھی۔ اور بقاءِ اصلح کے فطری قانون کے مطابق اسی کو حق تھا کہ وہ سب پر فائق و برتر ہوکر رہے۔ چنانچہ یہی ہوا۔ اور ایسا ہی ہونا بھی چاہیے تھا! تاریخ کے صفحات ان کے شاندار کارناموں سے پُر ہیں اور اس کی بنیاد وہی ہے جو میں نے بیان کی۔

(باقی آئندہ)

موجودہ زمانہ کی بہترین سیاسی کتاب

"شہنشاہیت"

جدید سرمایہ داری کی مکمل تاریخ

شہنشاہیت کی حقیقت، اس کی تاریخ و تفصیل اور اس کے نتائج و اثرات پر اردو میں پہلی کتاب جس کی تقریب کے سلسلہ میں مولانا سید طفیل احمد صاحب مصنف مسلمانوں کا روشن مستقبل" لکھتے ہیں۔

"یہ کتاب جدید سرمایہ داری کی مکمل تاریخ ہے۔ جس میں دکھایا گیا ہے کہ یورپ کے ملکوں میں سرمایہ داروں کی محدود جماعت نے حکومت پر قبضہ کرکے نوعِ انسانی کو کس طرح غلام بنایا اور دنیا کے بازاروں پر قابض ہوکر اپنی ذات کیلئے عیش و آرام کے سامان کیونکر جمع کئے۔ اس کتاب کو اردو میں منتقل کرکے اردو داں پبلک پر بڑا احسان کیا گیا ہے۔"

اس کتاب کے مطالعہ سے موجودہ ہولناک جنگ کے اسباب و وجوہ بھی پورے طور پر سمجھ میں آجاتے ہیں صفحات ۲۰۰ قیمت مجلد عمہ ر

مینجر "مکتبہ برہان" قرول باغ دہلی